دورۂ ترکی کے مشاہدات

از جناب خلیل حامدی صاحب

(۱۰)

[افسوس ہے کہ رباط کی تعلیمی کانفرنس کے فیصلوں کی خاطر پچھلی دو اشاعتوں میں یہ مضمون درج نہیں کیا جاسکا۔ یہ ماہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کے بعد کی قسط ہے]

مصطفیٰ کمال کے ایک ساتھی کی ہنگامہ خیز تالیف | شیخ نیشار تونا کو راس کتاب کا راز افشا کرتے ہوئے بتانے لگے کہ اس کے مصنف کا نام ڈاکٹر رضا نور ہے۔ یہ صاحب مصطفیٰ کمال کے گہرے ساتھیوں میں سے تھے۔ لوزان کانفرنس تک دونوں کی گاڑھی چھنتی رہی۔ مگر جب لوزان کانفرنس میں مصطفیٰ کمال نے اپنے تمام وعدوں اور اعلانات کے برعکس ترکی کو سیکولر ریاست قرار دینے اور مذہب کے خلاف تلوار کشی کا فیصلہ کر لیا تو اس وقت ڈاکٹر رضا نور مصطفیٰ کمال سے متنفر ہو گئے۔ چونکہ ظاہری فضا میں مصطفیٰ کمال کا اچھا خاصا اثر تھا اور اس کے اچھے ساتھی بھی اس کی بعض خوبیوں کی وجہ سے اس کے خطرناک اقدامات تک سے چشم پوشی کر رہے تھے اس لیے اس کے خلاف کوئی مضبوط محاذ قائم کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ ڈاکٹر رضا نور نے لوزان کانفرنس کے بعد مصطفیٰ کمال کے اصل حالات کی چھان بین شروع کر دی۔ اور اس چھان بین کے دوران جو اصل حقائق اُن پر کھلے وہ انہوں نے اس کتاب میں قلمبند کر دیئے۔ کتاب کا نام ہے "میری زندگی اور میری یادداشتیں" یہ چار جلدوں میں ہے۔ اس کتاب کا اصل مسودہ جو ڈاکٹر رضا نور نے اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا تھا برٹش میوزیم میں موجود تھا۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر رضا نور نے خود اپنے طور پر یہ مسودہ حفاظت کے لیے برٹش میوزیم کی تحویل میں دے دیا ہو۔ مسودے کی پیشانی پر یہ تحریر ہے کہ اس کتاب کو آج سے پچاس سال بعد شائع کیا جائے۔ حال ہی میں ایک صاحب برٹش میوزیم گئے تو اس کتاب پر اُن کی نظر پڑی۔ انہوں نے اس کی مائیکرو فلم حاصل کر لی اور اسے لا کر چھاپ دیا۔

شیخ نیشار اس کتاب کو اپنی الماری میں سے نکال لاتے، اور اس کے مختلف صفحات کا ترجمہ مجھے سنانے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مفصل کتاب نہ صرف ترکی کے اُس دور کی اصل تاریخ پیش کرتی ہے جب خلافت

کا خاتمہ ہو رہا تھا اور سیکولر ترکی کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں، بلکہ یہ کتاب حیرت انگیز اور سنسنی خیز انکشافات بھی کرتی ہے۔ چونکہ یہ کتاب خود ترکی میں چھپ چکی ہے اور کثیر تعداد میں اس کے نسخے پھیل چکے ہیں اور اس پر ابھی تک ترکی حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی ہمارے علم کی حد تک نہیں کی گئی ہے اس لیے اس کے بعض مندرجات کا بیان ذکر کرنے میں مضائقہ نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہے کہ مصطفیٰ کمال انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ اس کے صفحہ ۵۶۱۱ پر مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مصطفیٰ کمال حقیقت میں ترک تھا ہی نہیں۔

میں نے شیخ بشار سے پوچھا کیا فی الواقع یہ کتاب ترکی میں چھپ کر تقسیم ہو رہی ہے؟ موصوف مسکرا کر کہنے لگے یقین کیجیے، اس کے دس ہزار نسخے اب تک پھیل چکے ہیں اور صرف ۲-۳ ماہ کے اندر اندر اس کی یہ اشاعت ہوئی ہے۔ اسی مصنف کی ایک اور کتاب بھی ترکی کی تاریخ پر برٹش میوزیم میں موجود ہے، اس کی مائیکروفلم بھی حاصل کر لی گئی ہے اور وہ بھی عنقریب منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ شیخ بشار کی گفتگو سے یہ امر صاف جھلک رہا تھا کہ ترکی میں تبدیلی کی رفتار بہت تیز ہے اور پچھلے چند سالوں تک ترکی پر جن لیڈروں کا رعب چھایا ہوا تھا اور جس نظام کی پرستش ہو رہی تھی وہ جادو کافور ہو چکا ہے۔ ماضی کی قیادت پر تنقید شروع ہو چکی ہے۔ اگر بیرونی طاقتوں کی دسیسہ کاری اور اندر کے ملحد اور یہود نواز عناصر کا سیاسی اور اقتصادی دباؤ انتہائی حد کو نہ پہنچ رہا ہو تو ترکی مستقبل قریب ہی میں غیر معمولی تبدیلی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

رات کافی گزر گئی۔ شیخ بشار سے اجازت لی جو انہوں نے اس شرط پر دی کہ میں اور صالح اوزجان کل اُن کے ہاں افطاری کریں اور مزید تفصیل کے ساتھ تبادلۂ خیالات کریں۔ شیخ بشار فصیح عربی میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے والد سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانے میں سرائے سلطان میں کسی عہدہ پر فائز تھے۔

انقرہ میں مواصلات کا قابلِ تقلید نظام کڑاکے کی سردی اور نصف شب کی بے پناہ تاریکی۔ سڑکوں پر مکمل سکوت۔ سوچا کہ اب کافی دیر پیدل چلنا پڑے گا اور پھر جا کر کہیں سواری ملے گی۔ مگر صالح اوزجان نے سڑک پر آتے ہی کھمبے کا رخ کیا اور کھمبے پر لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ میں نے اس معنی خیز حرکت کی وجہ دریافت کی۔ مگر شاید وہ میری کمزوری اور پریشانی کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ میری پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے کہنے لگے یہاں کھڑے رہتے ہیں، شاید کوئی ٹیکسی مل جائے۔ میں نے کہا اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے تھے کہ اتنے میں ٹیکسی آگئی۔ ٹیکسی کے اندر بیٹھ کر کہنے لگے کہ ”یہ میری اُس حرکت کا نتیجہ ہے جو کھمبے کا بٹن دبا کر میں نے ابھی ابھی کی ہے۔ لاہور میں تو ہمیں ایک مرتبہ دن کو بھی ٹیکسی نہیں ملی تھی۔ مگر

انقرہ میں دیکھیے رات کو بھی بلا تاخیر ٹیکسی مل گئی ہے۔ نئی آبادیوں کے کھمبوں پر لگے ہوئے بٹنوں کو دبا دیجیے ٹیکسی سٹینڈ میں اطلاع ہو جائے گی اور ٹیکسی مقام مطلوب تک فوراً پہنچ جائے گی۔ یہ نظام انقرہ کی تمام نئی آبادیوں میں قائم ہے۔ یہ انقرہ کی حسنات میں سے ایک ہے۔ لاہور کا باشندہ اس نظام پر عش عش کر اٹھا۔

آج ۲۹ رمضان المبارک، جمعۃ المبارک کا دن ہے۔ جمعۃ الوداع کی نماز علی بیگ ڈیمرل کی یونیورسٹی میں ادا کی۔ یونیورسٹی میں چھٹی تھی۔ نمازیوں کی غالب اکثریت سرکاری ملازمین پر مشتمل ہے۔ صالح اوزجان نے بتایا کہ منصوبہ بندی وزارت کے تقریباً تمام بڑے عہدیدار نماز میں موجود ہیں۔ خطیب صاحب نے قیامت کے موضوع پر تقریر کی۔ یہ اندازہ مجھے ان احادیث اور آیات سے ہوا جو انہوں نے بار بار تقریر میں بیان کیں۔ نماز کے بعد صالح صاحب نے اکثر حضرات سے میرا تعارف کرایا۔ یہ سب لوگ خوب محبت، گرمجوشی اور تواضع سے ملے۔ اور یوں محسوس ہوا کہ سب ہی مولانا مودودی مدظلہ العالی سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہیں۔ صالح اوزجان سے میں نے دریافت کیا کہ کیا یہ لوگ مولانا محترم اور جماعت سے واقف ہیں؟ بتانے لگے کہ ان حلقوں میں ہم مولانا کی تصانیف (ترکی تراجم) پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس لیے واقفیت نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ صالح صاحب نے بتایا کہ مولانا محترم کی کتاب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" اسلامیات کے نصاب میں منظور ہو چکی ہے اور مجھ سے تقاضا ہو رہا ہے کہ میں جلد از جلد اسے چھاپوں۔[1]

عید کی تیاریاں | نماز جمعہ کے بعد صالح اوزجان مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر سنجان چلے گئے جہاں ان کی رہائش ہے۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے آئیں گے تاکہ شیخ لیشار کے ہاں افطاری کے لیے جا سکیں۔ میں نے ہوٹل میں یہ وقت گزارنے کے بجائے بازاروں میں گردش شروع کر دی تاکہ انقرہ کی عید کی چہل پہل بھرپور دیکھ لی جائے۔

انقرہ کے بارے میں بار بار یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ شہر ہے تو مسلمانوں کا مگر اسی تضاد سے لبریز ہے جو کراچی، قاہرہ، عمان اور طرابلس میں نظر آتا ہے۔ مسجدوں میں جا کر طبیعت خوش ہوتی ہے کہ حاضرین میں نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت ہے۔ بازاروں میں معاملہ بالکل الٹا ہو جاتا ہے۔ عورتوں کے نیم عریاں لباس، نوجوانوں کی آوارہ گردی، مردوں اور عورتوں کا باہوں میں باہیں ڈال کر چلنا، یہ سب وہ مظاہر ہیں جو بے خدا قوموں کی اجتماعی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں دیکھ کر ذہن شدید الجھن سے دوچار ہو

---

[1] رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے حالیہ اجلاس میں صالح اوزجان نے بتایا کہ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ انہوں نے اس کا ایک نسخہ بھی مولانا محترم کو پیش کیا۔

جاتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اگر استنبول اور انقرہ پر اسی تہذیب کا غلبہ رہا تو ترکی صحیح اسلامی تہذیب کا گہوارہ کیسے بن سکے گا اور اسلامی تہذیب کو بحال کرنے کے لیے اُسے کتنے شدید کام اور طویل محنت کی ضرورت ہوگی۔ جو عورتیں صحیح معنوں میں مسلمان ہیں وہ گھروں سے ہی نہیں نکلتیں، اور گھروں سے نکل کر بازاروں اور دفتروں اور محفلوں میں آکر رونق پیدا کرنے والی عورتیں یا تو مسلمان ہی نہیں ہیں، بلکہ یہودی ہیں یا ارمن، عیسائی ہیں یا دونمہ۔ اور اگر مسلمان ہیں تو ان خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں جنہوں نے دنیا کی ہر بُری بھلی چیز کو اہمیت دی ہے مگر اسلام کو اہمیت نہیں دی۔

البتہ ایک پہلو اِس تاثر کا یہ بھی ہے کہ عید یا کسی دوسرے تہوار کے جھگڑوں پر لاہور اور کراچی میں پاکستانی نوجوان جس غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ انقرہ جیسے مغرب پرست شہر میں نہیں نظر آتے۔ ترک نوجوانوں کے لباس میں ٹیڈیوں کا چھچھورپن نہیں ہے۔ ہے تو سوٹ مگر باوقار ہے۔ چہروں سے شرارت نہیں ٹپکتی بلکہ متانت اُجاگر ہے۔ لبنانیوں اور شامیوں کی طرح ترفّع اور خود پسندی نہیں پائی جاتی بلکہ تواضع اور محبت پائی جاتی ہے۔ نفاستِ ذوق، محبت اور اخلاص ان کے قومی خصائل ہیں۔

افطاری حسبِ وعدہ شیخ نشار کے ہاں کی۔ افطاری اور نماز کے بعد کھانا کھا رہے تھے کہ شیخ نشار نے بتایا کہ یہ آخری روزہ ہے۔ کل کو عید ہوگی۔ خاکسار نے دریافت کیا کہ کیا چاند ہو گیا ہے۔ شیخ نشار نے بتایا کہ ترکی میں عید چاند دیکھنے پر نہیں ہوتی بلکہ فلکی حساب کے تحت ہوتی ہے۔ ہمیں پہلے ہی معلوم ہوتا ہے کہ فلاں روز عید ہوگی اور ہمارا یہ فلکی حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ شیخ نشار کا دسترخوان نہایت پُرتکلف اور وسیع وعریض تھا۔ خصوصاً ترکی پلاؤ میں چیونزوں کی بہتات خوب تھی۔ اور بھی متعدد چیزیں ایسی تھیں جن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مگر خاکسار بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ پاکستان کے دسترخوان کا مقابلہ مشکل ہے۔ کھانا لانے کی خدمت شیخ نشار کی ایک صاحبزادی سرانجام دیتی رہی جس نے مکمل ساتر لباس پہن رکھا تھا۔ صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے تھے۔ کھانے کے بعد اطمینان سے مجلس جم گئی۔ اب تراویح کی مشغولیت باقی نہ رہی تھی۔

ترک حاجیوں کے لیے سرکاری انتظامات باتیں تو ہشت پہلو تھیں۔ ترکی حاجیوں کا قصّہ چھڑا تو شیخ نشار نے بتایا اب حکومت ہر سال حج کی سہولتوں میں اضافہ کرتی جا رہی ہے۔ اور جتنے لوگ حج کے لیے جانا چاہیں جائیں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی حجاج کی تعداد تمام دنیا کے حاجیوں سے زیادہ ہوتی ہے[1]۔ شیخ

---

[1] ترکی حاجیوں کی تعداد چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان ہوتی ہے۔ ترکی کی مجموعی آبادی ۴ کروڑ سے کم ہے یعنی پاکستان کی تہائی آبادی سے کچھ زیادہ۔

یشار نے بتایا کہ ہر حاجی پر پابندی ہے کہ وہ دو سو ڈالر کا انتظام کرے۔ کم از کم دس رومال اور دس جرابیں اس کے پاس ہوں تاکہ صاف ستھرے لباس کا مظاہرہ ہو۔ حج فلائٹوں میں یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ ائر ہوسٹس اسکرٹ نہ پہنیں بلکہ ٹخنوں تک پورا لباس پہنیں۔ ان کے صرف چہرے اور ہاتھ کھلے ہوں۔ ہر فلائٹ میں حکومت کی طرف سے ایک مفتی کا انتظام ہوگا جو حاجیوں کو موقع و محل کی مناسبت سے حج کے مسائل سے آگاہ کرے گا[1]۔ شیخ یشار نے افسوس کے ساتھ کہا کہ اس مرتبہ شام کی حکومت خشکی کے راستے سے ترکی حاجیوں کو گزرنے کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ اگر حاجیوں کی بسیں شام سے گزر کر جائیں تو انہیں صرف دو ہزار کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے مگر اب یہ بسیں عراق اور کویت سے ہو کر سعودی عرب میں داخل ہوں گی۔ اور انہیں سات ہزار کیلو میٹر کا سفر کرنا پڑے گا۔

قبرص کی حالت | عالمِ اسلامی کے مسائل کا ذکر چھڑا تو میں نے قبرص کے بارے میں شیخ یشار سے بعض سوالات کر دیئے۔ ترکی کے لیے قبرص کا مسئلہ وہی اہمیت و نزاکت رکھتا ہے جو پاکستان کے لیے کشمیر کو حاصل ہے۔ قبرص کی سیاسی صورتِ حال سے تو پاکستان کے مسلمان ناواقف نہیں ہیں۔ قبرصی ترکوں اور قبرصی یونانیوں کی باہمی کشیدگی اور قبرصی یونانیوں کے ترک آبادی پر مظالم کی داستان کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ یہ جزیرہ طویل مدت تک عثمانی خلافت کے تحت رہ چکا ہے۔ اِس صدی کے اوائل تک اس میں اسلامی تعلیم کا بڑا چرچا تھا۔ مگر جب سے انگریزوں نے قبرص میں قدم رکھا وہاں کا مسلمان بھی انگریزی تہذیب کا شکار ہوتا چلا گیا۔ شیخ یشار نے بتایا کہ ہم قبرصی ترکوں کے لیے آخر دم تک لڑیں گے۔ مگر جہاں تک قبرص کے ترک مسلمانوں کا حال ہے وہ اسلام سے بہت دُور ہو چکے ہیں۔ بگاڑ ان کے اندر وسیع پیمانے پر پھیل چکا ہے۔ اسلامی شعائر اور نماز و روزہ کا وہاں نام و نشان نہیں ہے۔ اِس مرتبہ رمضان المبارک کے آغاز پر ہم نے چار واعظ بھیجے۔ دو اس بنا پر واپس آگئے کہ انہوں نے جب اسلامی اخلاق اور اسلامی احکام کی تبلیغ شروع کی تو لوگوں نے اسے ناپسند کیا، اور اِن باتوں کو سننے سے انکار کر دیا۔ باقی دو بھی وہاں سے مسلسل خطوط لکھ رہے ہیں کہ ہماری تبلیغ سے لوگ ناخوش ہیں۔ اور مغربی تہذیب پر کسی قسم کی تنقید انہیں اچھی نہیں لگتی۔ بلکہ شیخ یشار نے رازدارانہ طور پر کہا کہ مفتی قبرص کا حال بھی بہت پتلا ہے۔ ان کے گھر کی تمام خواتین مغربی عورتوں کا لباس پہنتی ہیں۔ شیخ کہنے لگے کہ ایک طرف جنگی نقطۂ نظر سے قبرص کی اہمیت کو دیکھیں اور دوسری طرف وہاں کے مسلمانوں کی یہ غفلت دیکھیں کہ انہیں اپنے قومی

[1] اِس مرتبہ ترکی حکومت نے ان انتظامات کو مزید ترقی دے دی ہے۔

تشخص کا احساس تک نہیں ہے۔ شیخ نشار سے معلوم ہوا کہ قبرص کے ترک بہت بڑی تعداد میں روزگار کے لیے لندن اور جرمنی جا رہے ہیں۔ صرف لندن میں ۴۰ ہزار کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ جہاں تک قبرص کے مسئلے کا تعلق ہے ہم سو فیصد وہی احساس رکھتے ہیں جو ہمارے ترک بھائیوں کے ہیں۔ مگر شیخ نشار سے وہاں کے اخلاقی بگاڑ اور دینی کمزوری کا حال معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا۔ قبرص کے عیسائی صدر میکاریوس کو دنیا بھر کے صلیب پرستوں کی حمایت حاصل ہے۔ مگر قبرص کے مسلمان کے لیے صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی کا سہارا ہے۔ اگر وہ اس سہارے کو بھی چھوڑ دیں تو یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہو گی۔ اگر ان تمام مسلمان قوموں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے جو ظالم اور کافر طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں گرفتار رہیں تو یقیناً یہ مشترک نتیجہ برآمد ہو گا کہ یہ قومیں اخلاقی اور مذہبی ضعف میں مبتلا ہیں اور ان کے ابتلاء کے اسباب میں سے اہم سبب انہی دونوں پہلوؤں میں غیر معمولی کوتاہی ہے۔

میں نے شیخ نشار سے آخری سوال یہ کیا کہ آپ کے محکمۂ امور مذہبی کی سرگرمیوں کی تفصیل کیا ہے۔ نیز ترکی میں دینی تعلیم کے احیاء کا کام کس حد تک ہو رہا ہے۔ موصوف نے کہا اگر مختصر جواب درکار ہے تو میں ابھی بتائے دیتا ہوں اور اگر جملہ تفصیل پیشِ نظر ہے تو پھر ایک روز میرے دفتر میں آ جائیں، میں تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال دوں گا۔ میں نے موخر الذکر صورت کو ترجیح دی۔ اور ایک طویل سوالنامہ تیار کرنے کی اسکیم سوچ لی۔ چنانچہ شیخ نشار سے ہم نے اجازت لی، اور خاکسار برلن ہوٹل کی طرف اور صالح اوزجان اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔

نماز عید | عید کی پوری رات ریڈیو سے قرآن پاک کی تلاوت اور مذہبی تقریریں ہوتی رہیں۔ ترکی انداز کی دلچسپ نعتیں اور قصیدے بھی سنائے جاتے رہے۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی توپیں چلنی شروع ہو گئیں۔ گنتی تو یاد نہیں ہے لیکن دس گیارہ سے کم نہیں تھیں۔ یہ اس امر کا سرکاری طور پر اعلان تھا کہ آج انقرہ عید منا رہا ہے۔ جامع بیرم برلن ہوٹل سے کافی دور ہے۔ اس لیے میں نے نماز فجر ہوٹل ہی میں ادا کی۔ اور پاکستانی رواج کے مطابق خیال کیا کہ سورج طلوع ہو جانے پر عید گاہ کی طرف نکل پڑوں گا۔ طلوعِ آفتاب کے بعد کپڑے تبدیل کیے، چائے پی اور جامع بیرم کی طرف چل پڑا۔ قیاس تھا کہ لوگ کثرت کے ساتھ ہاتھوں میں جانماز لیے عید گاہ کی طرف جا رہے ہوں گے اور یہ اس امر کی علامت ہو گی کہ کچھ منٹ کے بعد نماز عید کھڑی ہو جائے گی۔ مگر عید گاہ کی طرف جانے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ترک دیر سے نماز عید پڑھتے ہیں۔ مجھے اب عجلت

کی حاجت نہ تھی۔ مگر خراماں خراماں جب جامع بیرم کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ مسجد کا بیرونی صحن بھی پوری طرح بھر رہا ہے اور اب لوگ مسجد سے باہر اپنے لیے جگہ بنا کر بیٹھ رہے ہیں۔ اور لاؤڈ اسپیکر سے قرآن کی تلاوت ہو رہی ہے۔ سردی سخت تھی، اتنی سخت کہ دماغ چکرانے لگا۔ جانماز اس لیے ساتھ نہ لی کہ چونکہ جلدی میں نکل رہا ہوں اس لیے مسجد کے اندر صف اول میں جگہ ملے گی۔ مگر اب نماز کھلے صحن میں پڑھنا ہو گی اور وہ بھی کیونکر۔ ترک آ رہے تھے۔ عام لوگ ہاتھوں میں جانماز لیے آتے اور بچھا کر بیٹھ جاتے۔ اور جس کے پاس جانماز نہ ہوتی وہ اوورکوٹ اتار کر اُسے بچھا لیتا۔ میں کیا کروں؟ "اتحاد" اخبار بک رہا تھا اُسے جانماز کی نیت سے خریدا اور بچھا لیا۔ مگر سخت تکلیف اور پریشانی۔ ایک ترک نے مجھے یوں مبہوت دیکھ کر اپنے پاس بلا لیا۔ اور اپنے گرم کمبل پر مجھے بٹھا لیا۔ فوج کا ایک باوردی دستہ آیا۔ اُن میں سے کسی کے پاس کوئی جانماز یا کمبل نہ تھا۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنا بھاری بھرکم فوجی کوٹ اتارا اور اُسے بلاتکلف بچھا لیا۔ صحت مند اور سردی کے عادی ترکوں کے لیے یوں کر لینا معمولی بات ہے۔ مگر اپنے تو کوٹ کے باوجود دانت بج رہے تھے۔ خطیب صاحب نے ۲۰ منٹ تک تقریر کی۔ معلوم نہیں کیا بات وہ کہتے رہے مگر فلسطین اور پاکستان اور اسلام اور جہاد اور شریعت اور حق و باطل کے کلمات بار بار استعمال کیے۔ یہ وہی خطیب ہیں جن کا ذکر میں پیچھے کر چکا ہوں۔ تقریر کے بعد نماز کھڑی ہوئی اور خطبۂ عید پڑھا گیا۔ اور لوگ ایک دوسرے سے "بیرم مبارک" (عید مبارک) کہتے اور مصافحہ اور تقبیل سے اظہارِ محبت کرتے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اور میں رک گیا کہ خطیب سے بیرم مبارک کرتا جاؤں۔

حافظ ذکائی خطیب مسجد سے معلوم ہوا کہ عید کے روز لوگ نماز فجر کے وقت ہی مسجد میں آنے شروع ہو جاتے ہیں اور اُس وقت تک قرآن مجید کی تلاوت اور دعا و ذکر میں مشغول رہتے ہیں جب تک عید سے فارغ نہیں ہو جاتے۔ مسجد کے اندر کا کشادہ و طویل صحن نماز فجر کے وقت ہی پُر ہو گیا تھا۔ البتہ باہر کی زائد صفوں کے لوگ بعد میں آئے ہیں۔ ان میں سے میں بھی ایک ہوں۔ جامع بیرم چونکہ انقرہ کی قدیم ترین مسجد ہے اس لیے لوگوں کا اکثر و بیشتر رجوع اسی مسجد کی طرف رہتا ہے۔ نماز کے معاملے میں ترکوں کا اہتمام ہر بات سے عیاں ہے۔ حاضرین میں ہر طبقے کے لوگ موجود تھے۔ ایک اور بات دیکھ کر طبیعت کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ ہے گداگروں کی کمی۔ صرف چار یا پانچ گداگر نظر آئے۔ ورنہ جتنا بڑا یہ مذہبی اجتماع تھا پاکستان کے تناسب کے مطابق یہاں سینکڑوں گداگر ہونے چاہییں تھے۔ مگر پورے ترکی میں گداگری کم ہے۔ ترک محنت کو گداگری پر ترجیح دیتا ہے۔ اور جو گداگر ہے وہ یقیناً مستحق ہے۔ مجھے اس موقع پر قاہرہ یاد آیا۔ قاہرہ گداگروں

سے بھرا ہوا ہے۔ اچھا بھلا تنومند آدمی آپ کے پاس ہاتھ پھیلا کر کہے گا اللہ یو دیك المطلوب یا عمی (چچا، اللہ تیری مُراد پُوری کرے گا) کچھ عنایت ہو۔ اور اگر آپ نے "اللہ کریم" اور "اللہ یُعطیک" کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی تو وہ آپ کے کپڑوں کو ہاتھ لگا لگا کر الحاح جاری رکھے گا۔ اس کی وجہ غربت بھی ہو سکتی ہے اور پیشہ ورانہ عادت بھی۔ نماز کے بعد ترکی کا اسلامی ہفت روزہ "اتحاد" بکثرت بکا۔ بلکہ ایک صاحب نے اتحاد کا ایک پُورا انبار خرید لیا اور بیچنے والے لڑکے سے کہا کہ اسے لوگوں میں مفت تقسیم کرتے جاؤ۔ اتحاد کا یہ عید نمبر تھا اور اس میں کئی اسلامی مضامین درج تھے۔

عید ملاپ | عید ملاپ کا طریقہ تمام اسلامی ممالک میں تقریباً یکساں ہے۔ عرب ممالک میں عید ملنے کا رواج یہ ہے کہ ایک دوسرے کو "من العائدین" (خدا کرے کہ آپ کی یہ عید بار بار نصیب ہو) یا "کل عام وانتم بخیر" (آپ کا ہر سال خیر و عافیت سے گزرے) کہیں گے۔ پاکستان اور ہندوستان میں مصافحہ اور معانقہ کا رواج ہے۔ ترکی میں مصافحہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی "بیرم مبارک" کہتے ہیں۔ جو شخص عید ملنے کے لیے آئے گا وہ بیرم مبارک اور علیکم سلیک کے بعد محفل میں بیٹھ جائے گا۔ مٹھائی اور قہوہ اُسے پیش کیا جائے گا۔ اور جب واپس جانے لگے گا تو صاحب خانہ کے رخسانہ کو بوسہ دے گا۔ سعودی عرب میں صاحب خانہ کی طرف سے رخصت ہونے والوں کے ہاتھوں پر خوشبو بھی لگائی جاتی ہے۔ صالح اوزجان صاحب ہوٹل میں آگئے اور مجھے ساتھ لے لیا تاکہ دوستوں سے عید ملنے کے لیے جائیں۔ مَیں نے بھی یہ موقع غنیمت سمجھا۔ لوگوں سے ملاقات بھی ہو گی۔ ترکی رسوم کا مشاہدہ بھی ہو گا اور حالات و نظریات کی جھلک بھی ملے گی۔ سب سے پہلے سعودی سفیر کے ہاں گئے۔ سعودی سفیر کے ہاں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ دو عرب خواتین بھی ملنے کے لیے آگئیں۔ سفیر صاحب اور تمام دوسرے حضرات کے ساتھ انہوں نے مصافحہ کیا۔ صالح اوزجان اور مَیں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ خواتین کو غالباً اور حاضرین کو بھی شاید ہماری یہ "رجعت پسندانہ" حرکت ناگوار گزری۔ سفیر صاحب نے خندۂ استہزاء کے ساتھ اس کی فوری توجیہ یہ کر دی کہ "ہم دونوں شافعی ہیں" اس لیے اضطراراً عورتوں سے ہاتھ نہیں ملا رہے۔ صالح اوزجان نے بعد میں مجھ سے پوچھا کہ کیا تم اس توجیہ کا مطلب سمجھ گئے تھے؛ اور پھر خود ہی بتانے لگے کہ شافعی مسلک کے مطابق اگر کوئی باوضو شخص عورت کو چھوئے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی مسلک کا سہارا لیتے ہوئے سفیر صاحب نے حاضرین کو یہ تأثر دیا ہے کہ چونکہ ہم وضو سے ہیں، اور مسلکاً شافعی ہیں اس لیے وضو ٹوٹ جانے کے خطرے کی بنا پر عورتوں سے مصافحہ نہیں کر سکے۔ مَیں نے کہا کیا حنفی یا حنبلی

مسلک میں غیر عورت سے ہاتھ ملانا جائز ہے؟ جدید تہذیب نے مسلمانوں کو جن روگوں میں مبتلا کر دیا ہے اُن سے قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ کہیں انسان بچ نکلتا ہے اور کہیں ملوث ہو جاتا ہے۔ عید کے روز یہی دُعا دل و زبان پر رہی کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے روزوں کو قبولیت و اجر سے نوازے۔ اور کوئی ایسا کام نہ کروائے جو کیے کرائے پر پانی پھیر دے۔

ترکی کی کسان پارٹی کے نائب صدر اسماعیل حقی بھی سعودی سفیر سے عید ملنے کے لیے آئے۔ عدالت پارٹی میں شامل تھے۔ مگر اب قوم پرستوں سے مل گئے ہیں۔ ترکی زبان میں اپنی نئی تصنیف انہوں نے سفیر صاحب کو پیش کی۔ اس کتاب میں انہوں نے بتایا ہے کہ یہودیوں نے کس طرح ترکی کو نقصان پہنچایا ہے۔ فری میسن اور دیگر یہود نواز اداروں پر کتاب میں مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ صالح اوزجان اسماعیل حقی کی گفتگو کا عربی ترجمہ کرتے رہے۔ اسی مناسبت سے ترکی کی تاریخ حاضر پر گفتگو چل نکلی۔ سفیر صاحب نے ایک نہایت پتے کی بات کہی وہ یہ کہ ترکوں کے مقابلے میں ہم نے انگریزوں سے مدد حاصل کی اور نتیجۃً ہم انگریزی استعمار کے غلام ہو کر رہ گئے۔ اب پھر ہم اپنے داخلی مسائل حل کرنے کے لیے روس کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ روسی سامراج مسلط ہو گیا تو اُس سے نجات پانے کے لیے کتنی مدت درکار ہو گی۔

سعودی سفیر کے ہاں سے فارغ ہو کر انڈونیشی سفیر صاحب کے ہاں آ گئے۔ انڈونیشی سفیر بہت پکے مسلمان ہیں۔ بڑی بے تکلفی اور محبت سے ملے مجھے بتانے لگے کہ جکارتا میں میرا گھر ہے۔ وہاں میرے پاس مولانا مودودی کی تمام عربی تصانیف موجود ہیں۔ میں نے انہیں بار بار پڑھا ہے۔ یہاں انقرہ میں بھی اُن کے پاس مولانا محترم کی عربی کتابوں کا ایک سیٹ موجود ہے۔ بڑے برادرانہ انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ اور بار بار مولانا محترم سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتے رہے۔ مجھے تاکید کی کہ میں ہر نئی عربی کتاب سے انہیں مطلع کر دیا کروں۔ خریدنے کا انتظام وہ خود کریں گے۔ عیسائیت اور قادیانیت کے رد میں انہیں لٹریچر کی شدید ضرورت ہے۔ عربی میں ہو یا پھر بدرجۂ آخر انگریزی میں۔ عید کی چہل پہل پر انڈونیشی سفیر بھی بڑے خوش تھے۔ بتانے لگے کہ ترکی کا نوجوان طبقہ نماز کی طرف خوب مائل ہو رہا ہے۔ انہوں نے محلہ سفراء کی مسجد میں نماز پڑھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ الٹرا ماڈرن لوگوں کا محلہ ہے۔ مگر حاضری پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ دُور دُور تک سڑکیں رُک گئیں۔ سفیر صاحب کے بیان کے مطابق ان حاضرین

ہیں ۷۰ فیصد نوجوان تھے۔ مولانا محترم کے دورۂ ترکی کے منتظر ہیں۔ اس بارے میں انہوں نے بعض تجاویز بھی مجھے نوٹ کروائیں۔ انڈونیشی سفیر کے ہاں سے نکل کر تونسی سفیر کا رُخ کیا۔ ان کا نام احمد بن عرفہ ہے۔ تونس کے مشہور امام و محدّث ابن عرفہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اپنی گفتگو میں اجتہاد اور روشن خیالی پر زور دیتے رہے۔ تونس اس وقت جس قدر "روشن خیال" ہو چکا ہے اُس کے بعد اب معلوم نہیں مزید کتنی روشن خیالی درکار ہے۔ صالح اوزجان صاحب حال ہی میں تونس کا دورہ کر کے آتے ہیں اور تونس کی بے حیائی اور اخلاقی انحطاط کا ذکر کرتے وقت کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ یہ سب اُسی روشن خیالی اور اجتہاد کی برکت ہے جسکی مزید ضرورت کا اظہار سفیر صاحب نے کیا۔ سفیر صاحب خود ہی کہنے لگے کہ میں نے اسلام کا بنیادی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ میرے لیے ایسی کتابیں تجویز کی جائیں جو اسلام کو سمجھنے میں مدد دیں۔ ان ملاقاتوں کے اصل خواہشمند صالح اوزجان تھے۔ میں تو صرف عید گزارنے کے لیے ان کے ساتھ منسلک تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اگریکلچرل انجینئر استاد احمد کے ہاں کھایا۔ موصوف نے بتایا کہ وہ ترکی کو چھوڑ کر مکّہ معظمہ جانا چاہتے ہیں۔ وہاں اپنی ملازمت کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ترکی میں حق اور باطل کی جو کشمکش برپا ہے اُسے چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے۔ بتانے لگے میری بچیاں جوان ہو رہی ہیں، موجودہ ماحول کے اندر ان کی اسلامی تربیت نہیں کی جا سکتی۔

عید کے بعد برلن ہوٹل چھوڑ کر صالح اوزجان صاحب کے مکان پر منتقل ہو گیا جو انقرہ سے ۱۵۔۲۰ میل دُور سنجان نامی آبادی میں واقع ہے اور ان کا دفتر اور مکتبہ انقرہ میں ہے۔ بڑے درویش آدمی ہیں۔ ان کا مکان بھی نہایت تنگ اور سادہ سا ہے۔ بارشوں کی وجہ سے راستہ کیچڑ سے اٹا ہوا اور خاصا دشوار گزار۔ بس سے اُتر کر جب گھر کے قریب پہنچے تو صالح اوزجان نے میرا سامان باصرار اپنے سر پر اٹھا لیا۔ ان کی یہ محبّت اور درویش منشی کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ڈاکٹر ہیں۔ ماہنامہ ہلال کے ایڈیٹر ہیں۔ ایک اچھے اسلامی مکتبے کے مالک ہیں۔ طب کا پیشہ کرتے تھے مگر اسلامی تحریک کی ضرورت کے پیش نظر پریکٹس چھوڑ دی اور اب شبانہ روز تحریک کی خدمت کے لیے وقف ہیں۔ جفاکشی اور تیز روی کے پیکر ہیں۔ مولانا محترم کو اپنا استاذ اور مرشد کہتے ہیں۔

ترکی میں مولانا مودودی کی کتابوں کی اشاعت | شب سنجان بڑی مفید ثابت ہوئی۔ صالح اوزجان کے بچے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اب میں تھا اور صالح اوزجان۔ برف آمیز رات نے اپنے تاریک سائے پھیلا دیے۔

سُرخ ٹھیریل کے جو کور چھوٹے چھوٹے مکانات پر سناٹا چھا گیا۔ باہر جھانک کر دیکھا تو پوری آبادی بحرِ ظلمات میں غرق پائی۔ کہیں اِکّا دُکّا کسی روشندان سے بجلی کی روشنی جھلکتی۔ صالح اوزجان نے اپنے ہاتھ سے" امام بایلدی" (ایک ترکی کھانا) تیار کیا اور ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ نمازِ عشا کے بعد میں نے صالح اوزجان سے ایک سوال کر دیا جس کا جواب وہ آدھی رات تک دیتے رہے۔ میرا سوال یہ تھا کہ آج تک آپ نے ہماری کتنی کتابیں شائع کی ہیں اور ان کی رفتارِ اشاعت کیا ہے؟ صالح صاحب نے جواب کا آغاز اس تمہید سے کیا کہ تمہیں معلوم ہے، میں نے مولانا مودودی کی کتابوں کے ترکی ترجمے اور اُن کی طباعت کا کام اُن حالات میں شروع کیا تھا جب یہاں کسی کو یہ جراٴت نہ تھی کہ وہ کوئی اسلامی کتاب چھاپے۔ آج سے ۱۲ سال قبل تک ترکی پر وہ ہولناک فضا طاری تھی جو مصطفیٰ کمال کے عہد سے چلی آرہی تھی۔ عدنان مندریس نے پہلی مرتبہ مذہب کو تھوڑی بہت آزادی دی اور ہم لوگوں نے اپنے کام کی داغ بیل ڈالی۔ مگر اس کے باوجود کسی ایسی کتاب کو چھاپنا جو اسلام کے سیاسی اور دستوری نظام سے بحث کرے محال تھا۔ اور اگر ایسی کتاب چھاپ دی جائے تو ناشر کو خطرہ رہتا تھا کہ وہ ضبط کر لی جائے گی اور ناشر جیل کی ہوا کھائے گا۔ ۱۹۵۶ء میں ہم نے پہلی مرتبہ مولانا محترم کا ایک چھوٹا سا رسالہ" کلمۂ طیبہ کے معنیٰ" دس ہزار چھاپا۔ اس کے بعد لوگوں کی طرف سے اس مصنف کی مزید تحریروں کی مانگ پیدا ہوئی۔ چنانچہ ۵۸ء میں ہم نے" دینِ حق" نامی پمفلٹ ۵ ہزار شائع کیا۔ دینِ حق کی اشاعت سے ہمارے حوصلوں میں بے حد اضافہ ہوا کیونکہ اسے پڑھے لکھے طبقے نے بڑا پسند کیا اور سرگوشیوں کے انداز میں جابجا محفلوں میں ہمیں مبارک باد دی گئی۔ ہمارے پاس وسائل بہت کم تھے۔ میں تنہا اپنی جیب سے جو کچھ بنتا خرچ کرتا تھا۔ اسی زمانے میں میں نے اپنا ماہنامہ" اسلام" جاری کر لیا تھا۔ موجودہ ماہنامہ "ہلال" اسی کا جانشین ہے۔ اپنے ماہنامے میں میں نے بعض مضامین شائع کیے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ مجھ پر بارہا ان کتابوں کے چھاپنے پر مقدمات دائر ہوئے مگر الحمدللہ ہم ان مقدمات میں کامیاب ہوتے رہے۔ ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ ہم پر دوبارہ سختیوں کا پیغام لے کر آ گیا اور ہماری فکری تحریک کی رفتار ماند پڑ گئی۔ اب دوبارہ ہماری کوششیں بحال ہو رہی ہیں اور ہم تہیّہ کر چکے ہیں کہ ترکی میں اسلامی فکر میں جو کمزوری پائی جاتی ہے اُسے دُور کریں۔ ترکی ان دنوں سخت دھچکوں سے دوچار ہے مگر ہمیں یا بیں ہمہ اپنے کارواں کو آگے نکالنے کے لیے ہر طرح کی بازی لگانی ہے۔

لہ خلبات کی ایک تقریر۔

صالح اوزجان جب بات کرتے ہیں تو ان کا چہرہ اُن کے اندرونی تلاطم کی مکمل غمازی کرتا رہتا ہے۔ بالعموم وہ ہنس ہنس کر بات کرتے ہیں۔ ان کی پیشانی پر ہمیشہ خندہ روئی بکھری رہتی ہے۔ اپنے بارہ سالہ کام کی روداد سناتے وقت بے انتہا خوشی کا اظہار کرتے جاتے تھے۔ اس بات کی خوشی کہ موجوں کی ہزار کشاکش کے باوجود وہ سفینۂ دعوت کو آگے ہی بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اب تک ہماری جو کتابیں شائع کی ہیں، ان کی فہرست یہ ہے:

۱۔ کلمہ طیبہ کے معنی۔ دو ایڈیشن۔ ہر ایڈیشن دس ہزار

۲۔ دینِ حق

۳۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟

۴۔ سُود

۵۔ اسلامی تحریک کی اخلاقی بنیادیں

۶۔ اسلام کا نظامِ حیات

۷۔ اسلام کا اقتصادی نظام

۸۔ اسلام کا سیاسی نظام

۹۔ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

۱۰۔ رسالۂ دینیات

۱۱۔ تجدید و احیائے دین

۱۲۔ اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی

یہ تو وہ کتابیں ہیں جو صالح اوزجان نے خود شائع کی ہیں۔ مگر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب ہماری جدوجہد سے مولانا محترم کی کتابوں کی خوب مانگ پیدا ہو گئی اور ہم نے اپنا راستہ لڑ بھڑ کر ہموار کر لیا تو دوسرے کاروباری لوگوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا اور ہماری اجازت کے بغیر متعدد کتابیں شائع کر دیں مثلاً ضبطِ ولادت، اسلام اور جدید معاشی نظریات اور الجہاد فی سبیل اللہ دوسرے مکتبوں کی طرف سے چھپ چکی ہیں۔ صالح اوزجان اس بات پر مُصر تھے کہ میرے سوا یہاں کسی کو مولانا محترم کی کتابیں چھاپنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ میں دعوت کے نقطۂ نظر سے یہ کام کرتا ہوں اور دوسرے کاروباری ذہن کے

ساتھ ۔ صالح صاحب نے بتایا کہ خلافت و ملوکیت کا ترجمہ ہو چکا ہے، نظر ثانی ہو رہی ہے ۔ پردہ کا جھگڑا جاری ہے[1] ۔ تنقیحات زیر ترجمہ ہے ۔ تفہیم القرآن بالاقساط ماہنامہ ہلال میں شائع ہو رہی ہے ۔

راقم الحروف نے چند فقروں میں جو داستان زینتِ قرطاس کر دی ہے، اس کی تفصیلات دلچسپ بھی ہیں، حیرت انگیز اور المناک بھی ۔ صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ صالح اوزجان ان کتابوں کی اشاعت کی وجہ سے مہینے میں کئی مرتبہ سیکورٹی پولیس کے دفتر اور عدالت میں طلب کیے جاتے ہیں[2] ۔ مگر ہیں دھن کے مجاہد ۔ جیل جا چکے ہیں ۔ شہر بدر ہو چکے ہیں ۔ ہر طرح سے زچ کیے جا چکے ہیں ۔ مگر وہ اس عزم کے مالک ہیں کہ ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

---

۱ اس جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہے ۔ اب یہ کتاب بھی صالح اوزجان ہی شائع کریں گے ۔

۲ اب ان پر نیا مقدمہ یہ قائم ہو چکا ہے کہ انھوں نے ماہنامہ ہلال میں مولانا مودودی کا وہ مختصر سا پیغام چھاپ دیا تھا جو مولانا محترم نے قرآن مجید کے چودہ سو سالہ جشن منعقدہ راولپنڈی میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو بھیجا تھا ۔